نصاب میں تبدیلی پر اضطراب

ابوعمار زاہد الراشدی

اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم کے بارے میں متضاد خبریں سامنے آ رہی ہیں۔ حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ نصاب میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں کی جا رہی۔ وفاقی وزراء نصاب تعلیم سے اسلامی مواد کو خارج نہ کرنے کی یقین دہانیاں کر رہے ہیں اور اب وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے بھی کہا ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم اسلامی ہے اور اس میں اس حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ لیکن دوسری جانب ملک کے تعلیمی حلقے مسلسل حالت اضطراب میں ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ کے مختلف فورموں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ نصاب میں تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ نئی نصابی کتابوں میں متعدد ایسی تبدیلیاں موجود ہیں، جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ملک کے تعلیمی و امتحانی نظام کو آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ پیشرفت جاری ہے۔ ملک کے دینی حلقے بھی اس حوالے سے خاصے متحرک ہیں۔ گزشتہ روز جامعہ نعیمیہ لاہور میں مختلف دینی جماعتوں کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں اس صورت حال کو اضطراب انگیز قرار دیتے ہوئے تحریک ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز پر جدوجہد منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم نے بھی پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام ایک مشاورتی اجلاس ۵ اپریل کو مسجد امن باغبانپورہ لاہور میں مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کی زیر صدارت منعقد کیا، جس میں متعدد دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے شرکت کی اور جامعہ نعیمیہ لاہور کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں شرکائے اجلاس کو بریف کیا۔ اس موقع پر دو باتیں خاص طور پر سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ وزیر اعظم پاکستان کی زیر صدارت منعقدہ اجلاس کے حوالے سے جو یہ خبر آئی ہے کہ نصاب تعلیم سے سورۂ توبہ کے اخراج کا فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی جگہ تبدیل کر دی گئی ہے اور سورۂ توبہ کو جو زیادہ تر جہاد کے احکام و واقعات پر مشتمل ہے، میٹرک کی بجائے ایف اے کے نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے، جس سے وہ لاکھوں طلبہ اس کی تعلیم سے محروم رہیں گے، جو میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

دوسری بات یہ کہ اصل مسئلہ ایک سورہ یا چند آیات قرآنی کا نصاب میں شامل کرنا یا ان کی جگہ تبدیل کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل متنازعہ امر یہ ہے کہ ملک کے نظام تعلیم کو بتدریج آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے دینی حلقوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اجلاس میں بتایا گیا کہ پاکستان کے تعلیمی نظام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اسلام آباد میں امریکی سفیر محترمہ نینسی پاول اور آغا خان فاؤنڈیشن کے جناب شمس الحق لاکھانی کے درمیان باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوا ہے، جس کے تحت آغا خان فاؤنڈیشن اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرے گی اور حکومت امریکہ کی

طرف سے اسے ساڑھے چار سو لاکھ ڈالر دیئے جائیں گے۔ اس معاہدے پر وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال اور سندھ کے وزیر تعلیم جناب عرفان مروت نے بھی دستخط کیے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے اس معاہدے کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اس پر عملدرآمد کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خبریں بھی منظر عام پر آ رہی ہیں کہ آغا خان فاؤنڈیشن کے تعلیمی بورڈ کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے جو ۲۰۰۶ء سے باقاعدہ امتحانات لینا شروع کر دے گا، اس کے ساتھ ہی یہ خبریں بھی آ رہی ہیں کہ ملک کے تمام تعلیمی بورڈز کو جن کی تعداد تیس بتائی جاتی ہے، اس بورڈ کے ساتھ ملحق کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور آغا خان تعلیمی بورڈ کو امتحانی یونی ورسٹی کا درجہ دے کر ملک کے تمام تر امتحانی نظام کو اس کی نگرانی میں دیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ملک کے تعلیمی اور دینی حلقے یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ ملک کے سرکاری تعلیمی نظام کی نگرانی آغا خان فاؤنڈیشن کرے گی اور ظاہر ہے، جب ایسا ہو گا تو بات صرف امتحانی سسٹم تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ نصاب کی تیاری بھی اسی کی نگرانی میں ہو گی، اس طرح ملک کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت اور فکر و ثقافت، تمام تر دارومدار آغا خان فاؤنڈیشن کی پالیسی اور ترجیحات پر ہو گا، اگر حالات کی رفتار کار کا یہ تجزیہ اور مستقبل قریب کے خدشات کا یہ نقشہ درست ہے تو یہ انتہائی خطرناک بات ہے اور اس کے بارے میں ملک کے تعلیمی و دینی حلقوں کی طرف سے جس اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے، وہ نہ صرف درست ہے بلکہ اصل ضرورت سے کہیں کم ہے۔

پاکستان کے تعلیمی نظام کے بارے میں امریکی سفیر اور آغا خان فاؤنڈیشن کے مذکورہ معاہدے نے پاکستانیوں کے لیے وہ مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ اب ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کے معاملات بھی امریکہ نے براہ راست سنبھال لیے ہیں اور ہمارے وزراء نے اس پر دستخط کر کے اس صورتحال کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں مغربی حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور جو مطالبات سامنے آ رہے ہیں، ان کی طرف عملی پیش رفت کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ مغرب کے ان مطالبات میں سرفہرست مطالبہ یہ ہے کہ تمام تر تعلیمی نصاب سے دینی مواد کو خارج کر دیا جائے، اس لیے کہ جب ایک مسلم نوجوان کو عقیدے کی تعلیم دی جاتی اور اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام حق مذہب ہے اور باقی مذاہب حق نہیں ہیں، پھر اس کے ساتھ جب اسے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی نظام اور عمومی معاشرت میں دوسری اقوام کی پیروی کرنے کی بجائے اپنے دین کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کا پابند ہے، تو وہ ذہنی، فکری اور عملی طور پر اس عالمی برادری کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہتا، جس کی قیادت اس وقت مغرب کے ہاتھ میں ہے اور جسے ''اینڈ آف دی ہسٹری'' اور ''ترقی یافتہ سویلائزیشن'' قرار دے کر مغرب اسے پوری دنیا پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے کے درپے ہے۔

مغرب کے نزدیک مسلمانوں اور پاکستانیوں کے عالمی برادری اور سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عقیدے و ثقافت اور خاندان و معاشرت کے حوالے سے وہ تمام مواد تعلیمی نصاب سے خارج کر دیا جائے جو اسلام کے جداگانہ تشخص اور مسلمانوں کے خاندانی و معاشرتی نظام کی دوسری قوموں سے امتیاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس بناء پر اگر تعلیمی

نصاب کے بارے میں مغرب کا یہ موقف قبول کرلیا جائے، تعلیمی نظام میں امریکی مداخلت کا مطلب بھی یہی ہے تو پھر وہ چھوٹی چھوٹی اور جزوی باتیں غیر اہم ہوجاتی ہیں، جن کے حوالے سے ہمارے دینی حلقے اس وقت احتجاج کررہے ہیں اور تعلیمی نظام کا اہل فکری ڈھانچہ اور ثقافتی فریم ورک ہی سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے، پھر بات صرف تعلیمی نصاب تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی تشخص، اس کے الگ ملک کے طور پر قیام کی نظریاتی اساس اور تہذیبی پس منظر کا جواز بھی دھندلکوں کی نذر ہونے لگتا ہے، جسے ملک کا کوئی بھی محب وطن شہری ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرسکتا۔

نینسی پاول اور شمس الحق لاکھانی کے مذکورہ مبینہ معاہدے سے دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوگیا ہے کہ امریکہ یا مغرب نے پاکستان کے تعلیمی نظام ونصاب کے بارے میں اپنے مقاصد کی طرف پیش رفت میں پاکستان کے معروف حلقوں میں سے کسی پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ اس نے ذریعے کے طور پر ایک ایسی اقلیت کا انتخاب کیا ہے، جو اپنے عقیدے وفکر کے حوالے سے پاکستان کی غالب اکثریت سے کسی طرح کی ہم آہنگی نہیں رکھتی اور عالم اسلام کے بارے میں اس کے سیاسی کردار پر پاکستان کے دینی وتعلیمی حلقے واضح تحفظات وخدشات رکھتے ہیں۔ آغا خان فاؤنڈیشن یا آغا خان یونی ورسٹی یقیناً ایک تعلیمی ادارے کے طور پر متعارف ہے اور اسی حیثیت سے اسے سامنے لایا گیا ہے، لیکن آغا خان فرقے کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ ایک الگ فرقہ ہے، جو عقائد اور سیاسی کردار دونوں حوالوں سے عالم اسلام کے سواد اعظم سے الگ طرز عمل کا حامل ہے۔ اس طرح مذکورہ معاہدے کی رو سے پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نیا محاذ کھول دیا گیا ہے کہ وہ ایک طرف اپنے تعلیمی نظام اور تہذیب وثقافت کو مغرب کے تقاضوں اور دباؤ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف داخلی محاذ پر اپنے اکثریتی عقائد وروایات کو اقلیتی مداخلت اور دست برد سے بچانے کے لیے بھی محنت کریں۔ یہ ایک نیا محاذ ہے، جو مغرب نے کھول دیا ہے اور اب ملک کے دینی حلقوں کو آغا خانی گروہ کے بارے میں ملک کے عوام کو یہ بتانا ہوگا کہ اس اقلیتی فرقے کے عقائد کیا ہیں؟ ملت اسلامیہ کی سیاسی تاریخ میں اس کا کیا کردار رہا ہے؟ عالم اسلام کی موجودہ صورت حال میں وہ کس کیمپ میں کھڑا ہے؟ اور اسلام اور مغرب کی ہمہ گیر کشمکش میں وہ کس کی خدمات سرانجام دے رہا ہے؟

آغا خانی دوستوں کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے لیے جس جگہ اور کیمپ کا انتخاب کیا ہے، وہ ان کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہوگا اور انہیں اس کی مستقبل میں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی؟ جوں جوں بات آگے بڑھے گی، انہیں اس کا احساس ہوتا جائے گا، لیکن بدقسمتی سے جب وہ احساس وادراک کی اصل منزل تک پہنچیں گے تو واپسی کے تمام دروازے بند ہوچکے ہوں گے۔ گزشتہ صدی میں یہ رول اور کردار قادیانیوں نے پسند کیا تھا، وہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ چکے ہیں۔ مغرب نے اب ان کی بجائے اس کام کے لیے کسی اور کو چنا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مغرب کے نزدیک اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس کی ہے، جسے دوبارہ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ خیر یہ سوچنا آغا خان کمیونٹی کے ارباب دانش کا کام ہے، اگر انھوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے تو یقیناً اس کے نتائج وعواقب سے بھی وہ بے خبر نہیں ہوں گے۔

البتہ اپنے قارئین کو اس بات سے آگاہ کرنا ہم ان کا حق سمجھتے ہیں کہ ''آغا خانی فرقہ'' کون ہے؟ اور اس کا جداگانہ تشخص اور عقائد کیا ہیں؟ تو پنجاب یونی ورسٹی کے ''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مطابق یہ ''اسماعیلی فرقہ'' کی ایک شاخ ہے۔ ''اسماعیلی فرقہ حضرت امام جعفر صادقؒ'' کی وفات کے بعد باقی اہل تشیع سے اس اختلاف پر الگ ہوگیا تھا کہ باقی اہل تشیع نے امام جعفر صادق کے فرزند امام موسیٰ کاظم کو ان کا جانشین اور اپنا امام تسلیم کیا تھا، جب کہ اسماعیلیوں نے ان کی بجائے امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے امام اسماعیل کو ان کے جانشین کے طور پر اپنا امام قرار دیا تھا۔

باقی اہل تشیع کے نزدیک بارہویں امام کے غائب ہونے کے بعد اب ان کی دوبارہ واپسی تک انہی کی امامت چلتی رہے گی، مگر آغا خانی فرقے کے نزدیک اماموں کا یہ تسلسل نسل در نسل چلا آرہا ہے اور ان کے موجودہ امام پرنس کریم آغا خان انچاسویں امام ہیں، اسماعیلیوں کے مختلف گروہ ہیں، جن میں ہمارے ہاں خوجے، بوہرے، داؤدی اور آغا خانی معروف ہیں۔

''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مطابق آغا خانی فرقے کا عقیدہ یہ ہے کہ امام براہ راست خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اور عقائد وعبادات کی مختلف صورتیں متعین کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ قرآنی آیات کی تشریح میں اس کا قول آخری ہے، دنیا کا نظام اماموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اخروی نجات کے لیے امام سے تعلق قائم ہونا ضروری ہے اور جو شخص امام وقت کو تسلیم کیے بغیر مرگیا، وہ کافر کی موت مرے گا۔ اسماعیلی فرقے کی الگ شاخ کے طور پر آغا خانی گروہ کا آغاز ایران میں آقائے حسن علی شاہ کی امامت سے ہوا، جو آغا خان اول کہلاتے ہیں۔ ان کی وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ ان کے جانشین آغا خان دوم علی شاہ کی وفات ۱۸۸۵ء میں ہوئی، آغا خان سوم سلطان محمد شاہ ۱۸۸۵ء میں امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کی ولادت کراچی میں ہوئی اور انھوں نے جنوبی ایشیا کی سیاست میں سرگرم کردار ادا کیا۔ وہ برطانوی وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے اور انہیں اس دور میں متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ تحریک پاکستان میں بھی ان کے کردار کا بطور خاص تذکرہ ہوتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کی وفات کے بعد پرنس کریم آغا خان چہارم کے لقب کے ساتھ آغا خانیوں کے امام بنے اور اب تک وہی امام چلے آرہے ہیں۔ ''دائرہ معارف اسلامیہ'' میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں آغا خان فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے، جو جنوبی ایشیا، انڈونیشیا، چین، ملایا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے مختلف ممالک کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں آباد ہیں، جب کہ کراچی کو آغا خانی سرگرمیوں میں مرکزی مقام حاصل ہے۔

اس پس منظر میں اگر ملک کے تخلیقی اور دینی حلقے اپنے تعلیمی نصاب ونظام کے حوالے سے تحفظات کا اظہار کررہے ہیں اور تعلیمی سسٹم کو ایک اقلیت کے سپرد کردینے پر ان کا اضطراب بڑھتا جارہا ہے تو یہ غیر متوقع اور غیر منطقی ردعمل نہیں ہے۔ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اضطراب کو محسوس کریں، اس کے اسباب وعوامل اور نتائج وعواقب کا ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ جائزہ لیں اور اس چنگاری کو شعلہ بننے سے قبل حکمت عملی اور تدبر وحوصلے کے ساتھ قابو کرنے کی کوشش کریں، ورنہ پانی سر سے گزر جانے کے بعد پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ☆☆☆